© rasailojaraid.com

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

ایک زائر بیت اللہ کے تاثرات

(دوسری اور آخری قسط)

مکتبہ مکہ مکرمہ

سرزمینِ مکہ کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ تقدیس کا حامل ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ولادت سے لے کر ہجرت تک ترپن سال اس مقدس زمین کے پہاڑوں، ریگ زاروں اور گلی کوچوں میں گزرے۔ حجازِ مقدس کے لیے رختِ سفر باندھنے سے قبل مکہ معظمہ کے جن قابلِ دید مقامات کی فہرست ہم نے تیار کی تھی اس میں پہلا نام مولد النبیؐ کا تھا۔ جب تک مدینہ منورہ رہے مسجدِ نبوی ہی ہمارا محور و مرکز رہا۔ مگر مکہ پہنچتے ہی یہ مقام دیکھنے کی تڑپ دل کو بے چین کرنے لگی۔ پس ممتاز صاحب کی رفاقت میں چل نکلے۔ ہمارا کتابی علم بتاتا تھا کہ آنحضرتؐ کا مکان سوق الیل نامی گلی میں ہے جو شعب ابی طالب میں واقع ہے، لیکن مجھے جہاں لے جایا گیا وہاں گلی تھی نہ خانہ۔

ہم نے دیکھا اور حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ لب سڑک ایک پختہ دو منزلہ عمارت ہے جس پر "مکتبۃ مکۃ المکرمہ" کا بورڈ آویزاں ہے۔ زائرین جوشِ عقیدت و وارفتگی کے عالم میں اگر وہاں نہ منڈلا رہے ہوتے تو شاید ہمیں اس جگہ کے بارے میں مولد النبیؐ ہونے کا یقین کبھی نہ آتا۔ مکتبے میں ایک بڑا قفل لٹک رہا تھا، معلوم ہوا کہ یہ دروازہ عموماً مقفل ہی رہتا ہے۔ ہم اس مقدس گلی کو دیکھنے کو ترستے ہی رہ گئے جہاں سے آپ گزرا کرتے تھے، جہاں ابو لہب کی بیوی آپ کی راہ میں کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ وہ محلہ جہاں آپ کا بچپن گزرا تمام کا تمام محکمہ شاہراہات کی نذر ہو گیا۔ ان کی عنایت ہے کہ یہ مکان چھوڑ دیا جو کہ عظیم شارع ملک السعود کے کنارے زائرین کی نظروں کو فرحت بخشتا ہے۔ جلدی جلدی اس مقام کی برکات اور مہبط انوار الٰہیہ خیال کرتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے دعا مانگی اور رخصت ہوئے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھتہ بازار

مکہ معظمہ میں قیام کے دوران عزیز سلیم اختر نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اپنے دوست ممتاز کو چھٹی دلادی اور ان کے سپرد ہماری مینا باذی کے امور زیارات و سیاحت کی سربراہی سونپ دی۔ پہلے تو ہم سلیم میاں کی اس ناسلیم الطبعی پر دل ہی دل میں افسردہ ہوئے۔ پھر جو ممتاز ملے تو سلیم میاں کی مردم شناسی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ممتاز صاحب انتہائی منکسر المزاج، دلچسپ اور یوں کہیے کہ مکہ شریف کے دائرۃ المعارف تھے۔ معلومات کا چلتا پھرتا دفتر، زیادہ عرصہ مکہ میں نہ گزرا تھا، اس پر بھی موٹر گاڑیوں کی اقسام، ان کی قیمتوں سے لے کر بستر کی چادروں تک کے حسب نسب سے واقف تھے۔ اِدھر بات کی اُدھر جواب مل گیا۔ بات وہ کہیں کی کرتے گھوم پھر کر چھتہ بازار پر ختم کرتے۔ ان کے اس کثیر الاستعمال لفظ سے دیکھنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی اور بعد دیکھنے کے بے دریغ پکار اٹھے کہ جس نے چھتہ بازار نہ دیکھا اس نے مکہ معظمہ نہ دیکھا۔

حرم شریف سے باب المروہ کے راستے سے باہر نکلیں تو ایک بازار ہے جس پر ٹین کی چادروں کی چھت بنی ہے، یہ اس بازار کی وجہ تسمیہ ہے، حالاں کہ کافی کشادہ ہے مگر عملی طور پر کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اس بازار میں کیا نہیں ملتا۔ الائچی خورد و کلاں، زعفران، جائفل، جاوتری کی بوریاں بھری پڑی ہیں۔ کھلونے جاپانی، امریکی، ولائتی، چابی سے چلنے والے، سیل سے چلنے والے، ریموٹ کنٹرول سب موجود ہیں۔ جوتے، چپل، چرمی بیگ، جستی، چمکیلے، نازک سب انواع اقسام کے مگر اس صنعت پر تائیوان کی سبقت دیکھی۔ ظروف ایسے خوش نما کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ کراکری ایسی کہ نظروں میں کھب جائے۔ جی چاہے کہ ایک جہاز بھر کر لے جاؤ۔ پھل ترکاریاں تازہ بہ تازہ جیسے ابھی توڑ کر لائی گئی ہیں۔ برازیل سے کرسی لنکا تک یہ نعمت اس بازار میں آتی ہے۔ باورچی خانوں اور غسل خانوں کے لوازمات، جی عش عش کر اٹھا۔ ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، مووی پروجیکٹرز، ہر سائز ہر قسم، اعلیٰ سے اعلیٰ تر، حسن لغویٰ کے ساتھ تعیش کے ڈھیر۔ عطر و خوشبویات کی وہ اقسام جو ہم تاعمر رتی اور ماشوں میں حساب کرتے چلے آئے یہاں کلو اور نصف کلو کی دیدہ زیب بوتلوں میں دست یاب ہیں۔ یہیں سے صرافہ بازار اور دیگر مختلف بازاروں میں راستے جاتے ہیں۔

یہاں کے لوگ چوں کہ صرف سلا ہوا کپڑا یا تیار شدہ لباس خریدنے کے عادی ہیں، لہٰذا [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہوش ربا گون اور غضب باشی کے ملبوسات خیرہ کن روشنیوں میں دعوتِ دید دیتے ہیں۔ میں نے پاکستانی عورتوں کو بھی یہ لباس جسے پہن کر بے لباسی کا گمان ہوتا ہے خوب خریدتے دیکھا۔ اطراف و جوانب کے تمام بازار جو اس بازار میں کھلتے ہیں سیکڑوں چھابڑی فروش اپنی دکان داری جمائے رکھتے ہیں، لاہور کے لنگ محل اور ڈبی بازار کا سا سماں پیش کرتے ہیں۔ دکان داروں کو نہ بھاؤ بتانے کی فرصت نہ گاہک کو بھاؤ ٹھیرانے کی مجال۔ جو منہ سے نکل گیا فوراً ادا کر دو یا چلتے بنو۔ زیادہ اصرار کیا تو ...

بلائے جان ہے اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

سنبوُلی

روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس سے دسترخوان کی زیبائش برقرار رہتی ہے۔ یہی تو واحد نعمتِ خداوندی ہے جس کے حصول کے لیے جہانِ فانی کی تمام رونقیں برقرار ہیں۔ غمِ مرگ کی محفل ہو یا شادی کی تقریب یا کسی سیاسی لیڈر کی تقریر دل فریب روٹی کے بغیر نہیں برخاست ہو سکتی۔ غذائیت کے لحاظ سے کتنی بھی متوازن غذا مل جائے مگر روٹی بھی صاحبو! کیا چیز ہے، اور جناب سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ تقاضائے شکم کے آگے تقاضائے عشق بھی زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے۔ بقول سعدیؒ

چناں قحط سالے شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

مکہ معظمہ ہو یا مدینہ منورہ جہاں بھی زائرین پہنچتے ہیں سامان سڑکوں کے کنارے رکھا اور روٹی کا واویلا شروع ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی بساط بھر کام و دہن کی آزمائش میں نظر آتا ہے۔

یہاں کی روٹیاں خدا جھوٹ نہ بلائے تو آٹھ دس اقسام کی تو ضرور ہوتی ہوں گی۔ بڑی، چھوٹی، موٹی، پتلی، جہازی سائز، کتابی سائز اور لطف یہ کہ ہر ایک روٹی کی الگ ترکیب ساخت اور الگ نام۔ مگر جو ایک عجیب الخلقت چیز نظر آئی، وہ روٹی اور ڈبل روٹی کے بین بین شے تھی، اس کو سنبولی کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی گول مٹول چیز ہے۔ پہلے ہم نے اس کو بغور دیکھا، پھر اس کے استعمال کو دیکھا۔ ہر نماز کے بعد سلام پھیرتے ہی فوراً روٹی کی دست یابی کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ نماز کے بعد بازاروں کی رونق بحال ہو جاتی ہے بازاروں میں روٹیوں کی کمی نہیں۔ تنوروں اور ہوٹلوں کے علاوہ جنرل اسٹوروں، بیکریوں اور سڑک کے کنارے روٹی فروخت ہوتی ہے۔ جہاں روٹیوں کا اس قدر ذخیرہ ہوتا ہے کہ حاجیوں کی تعداد دو چند بھی ہو جائے تو روٹی کی بہتات ختم نہیں ہو سکتی مگر انسان اپنی جبلت سے مجبور ہے اور لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روٹی کے معاملے میں ادب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر ان دکانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں:

ع ڈِھڈ نہ پئیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں

بازار نوردی

نظم و ضبط کی پابندی سے انسانی طبائع جلد گریزاں ہو جاتی ہیں۔ یہی حال ہمارا اور غالباً سب ہی کا تھا۔ معلمین کی سرد مہری اور سلوک کی تلخی کا احساس کسی کو شدومد سے تھا اور کسی کو کم۔ جس کا ازالہ فارغ اوقات میں بازار نوردی سے کیا جاتا تھا۔ سچ پوچھیے تو ہمارا حال یہ تھا:

ع حیراں ہوں ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

روزمرہ کے استعمال کی اشیا پانی، دودھ، لسی، دہی، کریم، بالائی سربمہر فروخت ہوتے ہیں۔ ایک خاص خوبی جو پاکستان کے پیور فوڈ ایکٹ میں شامل نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے خورد و نوش جو بازار میں فروخت ہوتی ہیں، ان پر تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال ضرور درج ہوتی ہے۔ دودھ، دہی وغیرہ تو خیر سعودی عرب میں تیار ہوتے ہیں۔ مگر بسکٹ فرانس، ہالینڈ، انگلینڈ اور امریکہ سے۔ پنیر، مکھن آسٹریلیا سے۔ مربہ جات سنگاپور اور بھارت سے۔ چند مشروبات اچار، چٹنیاں پاکستان سے اور ان سب کے ڈبوں اور بوتلوں پر تاریخ انتہائے استعمال ضرور درج ہوتی ہے۔ لطف کی بات ملاحظہ ہو کہ ایک بہت مشہور شربت جو خیر سے پاکستان کی عمر سے زیادہ کا ہے اور ہمارے ملک میں کافی مقبول ہے، اس کی بوتل پر ہم نے کبھی تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال نہیں دیکھی، مگر یہی شربت پاکستانی شربت سے زیادہ خوش ذائقہ وہاں ملتا ہے جس پر تاریخ ساخت اور تاریخ انتہائے استعمال درج ہوتی ہے۔ پاکستانی اچار، چٹنیاں، مربے وغیرہ ہمہ اقسام وہاں ملتے ہیں جن پر تاریخ انتہائے استعمال باقاعدگی سے لکھی ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہی اشیا کئی کئی سال دکانوں میں پڑی رہتی ہیں اور انجام کار عوام کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ مگر کیا مجال کہ وہاں کسی دکان پر (EXPIRY) تاریخ انتہائے استعمال کے بعد کوئی خوردنی چیز فروخت ہو سکے۔

سبزی منڈی رات کے وقت کھلتی ہے مگر دن کا سا سماں ہوتا ہے۔ روشنیوں کا اس قدر عمدہ انتظام ہے کہ کیا مجال کہ آپ کی نظر سے سبزی یا پھل پر پڑا ہوا کوئی داغ دھبہ اوجھل رہ جائے۔ موسمی اور بے موسمی پھل اور ترکاریاں دستیاب ہیں۔ بھنڈی، توری، گاجر، مولی، مٹر بیک وقت خریدیے اور لطف اٹھائیے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی حال پھلوں کا ہے - کنو، مالٹا، آم، آڑو متضاد موسم کے پھل کثیر تعداد میں تازہ بہ تازہ ملتے ہیں - خریدار کریٹ کے کریٹ خریدتے ہیں - عوام میں قوتِ خرید بہت ہے - کئی کئی سو روپے کی پھل ترکاریاں خریدنا وہاں کے عوام کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے ؛ لیکن ہم لوگوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے -

ع ـــ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

فلوس

حرمِ نبوی اور بیت اللہ کی سعادت دیدار حاصل کرنے کا منصوبہ تو عرصے سے تھا ہی، اسی لیے باقاعدگی سے ٹی وی پر "اللسان العربي" دیکھا کرتے - فضائل حج، فرائض حج، حج کیسے کریں وغیرہ مسائل کی کتابیں پڑھتے یہاں تک کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے عربی کا کورس پڑھ لیا اور سند بھی حاصل کی - کچھ نہ کچھ عربی کی شد بد ہو گئی اور سوچا کہ جب بھی حج کا موقع ملا تو دوسرے لوگوں کی طرح بالکل بدھو نہیں ہوں گے اور اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کے قابل رہیں گے - مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ پڑھنے والی عربی اور بولنے والی عربی میں تو بہت ہی دور کا تعلق ہے -

عزیز میاں امجد صاحب جن کے پاس میں نے مدینہ شریف میں قیام کیا، گو وہ گزشتہ سال پاکستان سے گئے ہیں مگر فرفر عربی لہجے میں بولتے ہیں - حالاں کہ مجھے یقین ہے کہ پچھلے سال وہ عربی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے اور ان کی عربی استعداد بچپن میں صرف قرآن شریف پڑھنے تک محدود تھی اور اب فلوس فلوس کرتے پھرتے ہیں - ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور پوچھ ہی لیا کہ عزیزم یہ فلوس کیا بلا ہے - تم جس دکان والے کے پاس جاتے ہو فلوس فلوس ضرور کرتے ہو - ہنس کر بولے - انکل - فلوس پیسوں کو کہتے ہیں - جیسے اپنے ہاں کوئی چیز خریدنی ہو تو ہم پوچھتے ہیں کہ کتنے پیسوں کی ہے - اسی طرح یہاں کم فلوس کہتے ہیں - ہم نے بھی بات گرہ میں باندھ لی اور فلوس فلوس کرنے لگے -

ع ـــ سپردم بتو مایۂ خویش را

شاپنگ

مدینہ طیبہ میں قیام ہو اور مسجدِ نبوی کی بے پناہ سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے، مکہ معظمہ میں مناسکِ حج کی تکمیل ہو، پاکستانی ہوں یا ایرانی، افریقی ہوں یا مصری شاپنگ کرنا بھی یہاں کے قیام کا جزوِ لاینفک ہے - ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حج کے دوران شاپنگ بھی "مستحب عمل" ہے - مدینہ طیبہ میں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسجد نبوی کے عظیم دروازوں کے باہر ہی بڑے بڑے شاپنگ سنٹر ہیں جبکہ مکہ معظمہ میں حرم سے چند قدم کے فاصلے پر کئی کئی منزلہ عمارتوں میں ہوش ربا زیب و آرائش و آسائش کے سامان دعوتِ دید دیتے ہیں، جہاں ہمہ وقت ہجوم رہتا ہے۔ مدینہ شریف میں تو حج کے زمانے میں تقریباً تمام رات بازار کھلے رہتے ہیں اور گہما گہمی ہوتی ہے۔

حج پر روانگی سے قبل میرے اور راہلیہ کے درمیان یہ متنازعہ فیہ مسئلہ رہا کہ فلاں فلاں چیز ضروری لانی ہے، جس سے میں نے بہ جبر یہ کہہ کر منع کر دیا کہ حج کرنے جا رہے ہیں یا شاپنگ کرنے۔ وہ بے چاری خاموش ہو رہیں۔ روانگی سے قبل میری چھوٹی ہمشیرہ نے بہنوئی کے لیے ایک گرم سوٹ کا کپڑا لانے کی فرمائش کر کے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ مشرقی تہذیب کی رو سے بہنوئی کی فرمائش رد کرنے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ میری اہلیہ نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، مدینہ میں امجد صاحب سے جب ایک گرم سوٹ کا کپڑا خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ انکل، یہ کپڑا آپ کو کراچی میں سستا مل جائے گا۔ یہاں تو گرم کپڑا بہت مہنگا ہے کیوں کہ نہ یہاں سردی پڑتی ہے نہ لوگ خریدتے ہیں، دکان دار بہت کم گرم کپڑا رکھتے ہیں اور نسبتاً گراں ہوتا ہے۔ بازار کا چکر لگایا تو حقیقت واضح ہو گئی۔ گرم سوٹنگ اسی ریال سے دو سو ریال فی گز تھی یعنی تین سو روپے سے نو سو روپے پاکستانی سکہ رائج الوقت۔ بہ امر مجبوری پچاسی ریال فی گز کا ایک کپڑا لے لیا جسے بہت عمدہ نہیں کہا جا سکتا۔

ہر دو متبرک شہروں میں بعد نماز شاپنگ کے لیے لوگ جوق در جوق رواں دواں ہوتے ہیں۔ شاپنگ سنٹروں پر ہی کیا موقوف سڑک کے کنارے پھیری والوں کے ارد گرد جم غفیر ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہے بک رہا ہے۔ بس خرید لو۔ ہم لوگ دوسری فلائٹ سے پہنچے تھے، اس سے قبل صرف بحری جہاز کے مسافر وہاں آئے تھے جن کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ مگر محسوس ایسا ہوتا تھا کہ زائرین جہاز سے اتر کر بازاروں میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ ہم نے پہلے ہی دن پاکستانی حجاج کے ہاتھوں میں کنگ سائز کے ٹیپ ریکارڈر دیکھے۔ عورتیں کپڑے کی دکانوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں کہ شاید آج کے بعد پھر نہیں ملے گا۔ میاں امجد مدینہ کے رہائشی ہیں، جب ان کو یہ بات سنائی تو بولے کہ یہ لوگ جو سامان فٹافٹ خرید رہے ہیں ستجربہ کار ہیں۔ کیوں کہ عنقریب بھاؤ بڑھ جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا، جوں جوں حجاج آتے رہے ہر چیز کے نرخ بڑھتے رہے۔

ایک محترم دوست مدینہ میں مل گئے جو جج کے عہدے پر فائز تھے۔ مجھے اصرار کر کے اپنے ہمراہ لے گئے اور ایک دکان میں جا گھسے، کہنے لگے اب کوٹ پتلون کا زمانہ تو ختم ہو گیا، دو چار شیروانیوں کا کپڑا لینے کا ارادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ دو شیروانیوں کا ایک سو ریال گز کا دگونا خریدا۔ پھر ایک فاختائی رنگ کا کپڑا خریدا، پھر ایک اور۔ اور آناً فاناً تین چار ہزار ریال کا کپڑا بندھوا لیا۔ میں نے اتنے ریال کہاں دیکھے تھے، اللہ کی پناہ! ؏

بہ بیں تفاوت کہ از کجاست تا بہ کجا

شُرطے

حرم بیت اللہ ہو یا حرم نبوی۔ شاہراہیں ہوں یا تجارتی مراکز۔ گہری خاکی وردی میں ملبوس ایک مخلوق کسی نہ کسی سے الجھتی نظر آتی ہے۔ یہ کہلاتے ہیں شُرطے، جن کو ہمارے ملک میں سپاہی کہتے ہیں۔

سپاہی ہمارے ملک میں ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ان کا کام نظم و نسق برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ہمارے سپاہی رو رعایت، سفارش شخصی یا مالی سے چشم پوشی کر ڈالتے ہیں۔ کہنے کو شرطوں کا کام بحالی نظم و نسق ہے، مگر کیا مجال جو ذرہ برابر بھی کوتاہی ہو جائے۔ لہجہ انتہائی کرخت۔ گفتگو سفاکانہ۔ صرف اپنی کہنی دوسرے کی نہ سُنی۔ معلموں کے توسط سے جو حضرات قیام پذیر ہوتے ہیں ان کی مصروفیات صرف نماز اور شاپنگ تک ہی محدود رہتی ہیں اور اس مخلوق سے واسطہ کم ہی رہتا ہے مگر چوں کہ میں ہمہ وقت کار میں آمد و رفت رکھتا تھا اس وجہ سے شرطوں سے واسطہ ناگزیر تھا۔

بات تو یہ ہے کہ جہاں احساس ذمہ داری ہو، فرائض کی بجا آوری کے لیے سختی لازمی ہے۔ مکہ میں ایک دن عزیزم جاوید اختر کے ساتھ کار میں جا رہا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ شرطے نے کون سی غلطی پر کار روک دی ہے۔ جاوید اختر کار سے اُترے۔ انتہائی ادب سے اپنا اقامہ (شناختی کارڈ) دکھایا، پھر شُرطا میری طرف متوجہ ہوا۔ جاوید اختر نے حاجی حاجی کہا۔ شُرطے نے انتہائی تند لہجے میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میرے پلّے کچھ نہ پڑا، صرف یہ دیکھا کہ جاوید صاحب بڑے ادب سے تائب تائب کر رہے ہیں۔ پھر شُرطے نے ڈانٹا، پھر جاوید نے تائب تائب کی گردان شروع کر دی۔ آخر شُرطے نے ہاتھ کے اشارے سے ایسا اشارہ کیا جیسے کہتا ہو کہ دفع ہو جاؤ، اور واقعی جاوید دفع ہونے کے انداز سے کار میں سوار ہو گئے۔ راستے میں مَیں نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ سڑک ون وے ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں دھر لیا گیا تھا۔ بس اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں تائب تائب کہتا رہوں۔ یہ اس کی مہربانی تھی جو حاجی (آپ کو) ساتھ دیکھ کر مجھے بخش دیا۔

سڑکوں پر کاروں اور ٹریفک کو کنٹرول کرنا بھی شُرطوں کا معجزہ ہے۔ ان کے جرمانے یا سزا کی داد نہ فریاد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مختارِ کل ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ حج کے دوران لاکھوں حجاج کے اجتماع میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا - ٹریفک کے کنٹرول کا دنیا میں یہ واحد نظام ہے جو ان سنتریوں کے پاس بے پناہ اختیارات کی وجہ سے قائم ہے - میرے ایک واقف کار بولے - ڈاکٹر صاحب! سعودی عرب کے سپاہی چوں کہ رشوت نہیں لیتے اس لیے وہ بہترین منتظم ہیں - مجھے رشوت نہ لینے کا راز معلوم تھا، اس وجہ سے ان کو جواب دیا کہ بھائی آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کے سنتری کو کس قدر تنخواہ ملتی ہے - ڈھائی ہزار ریال - مکان، بجلی، پانی، گیس مفت - یعنی پاکستان کے دس گیارہ ہزار روپے کے برابر - جب کہ ہمارے ملک میں سپاہی نام کی مخلوق کو تین چار سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی - اس صورت میں یہ بے چارہ کیا کرے - کبھی اس غریب کی حالتِ زار بھی تو دیکھو -

بہترین یادگاریں

ماثر و مقابر اور مقاماتِ مقدسہ کا تعین و نظام تحفظ ترکوں کے عہدِ حکومت میں قائم کر دیا گیا تھا - افسوس ہے کہ اب اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی - نہ ساکنانِ شہر اس کو لائقِ التفات گردانتے ہیں، نہ کارکنانِ حکومت کو یہ خیال ہے کہ صحابہ کرام اور اپنے اسلافِ عظام کی بہترین یادگاروں کو امتدادِ زمانہ کی دست برد سے محفوظ کر لیا جائے تاکہ رہ نوردانِ کوچۂ محبوب آثارِ رفیقانِ رسول کی تلاش و جستجو سے اپنی آتشِ شوق بجھا سکیں -

دارِ ارقم کا نام بعثتِ محمدی کے دور میں اور اس کے بعد اسی رشتے سے تاریخی شان و تجمل کا حامل رہا - جائے وقوع کا تو تاریخی حوالوں سے ہمیں یہی علم تھا کہ جبل بوقبیس کے سایہ میں واقع تھا - یہاں بہت ڈھونڈا مگر لاحاصل - یہ مقام بھی توسیعِ شاہراہ کی نذر ہو گیا اور صفا مروہ کی جانب باب دارِ ارقم باقی رہ گیا جو دارِ ارقم کی جانب ہمیشہ کھلتا تھا اور جس کی نسبت سے اس دروازے کا نام باب دارِ ارقم رکھا گیا تھا - یہ مکان صحابیِ رسول حضرت ارقمؓ کی ملکیت میں تھا، یہی وہ مقدس جگہ تھی جہاں بعثت کے بعد آنحضرتؐ کی اپنے صحابہ کرام کے ساتھ قریشِ مکہ کے خطرناک منصوبوں کے پیشِ نظر مجلسیں اور نشستیں ہوتی تھیں - یہاں آپ نے مکی دور کا بیشتر حصہ گزارا - یہی وہ مکان ہے جہاں حضرت عمرِ فاروق ایمان کی روشنی سے سرفراز ہوئے - پھر بڑے بڑے متلاشیانِ حق مثلاً زید بن خطاب، مصعب بن عمیر، عبداللہ ابن ام مکتوم، صہیب بن سنان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا -

کہاں کہاں تاریخ کے یہ مکنون اور عظمتِ ایمان کے آثار و نقوش موجود ہیں، اس کے متعلق صحیح طور سے کچھ کہنا مشکل ہے - قلب و ذہن ان کی تلاش و جستجو کے لیے بہرحال بے قرار رہتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مہرباں ہیں کیسے کیسے

منشی عبدالرحمٰن خان ملتان کی مشہور شخصیت ہیں - ماشاء اللہ ساٹھ سے ایک دہائی عمر زیادہ ہونے کو آئی ہے - تصنیف و تالیف کا یہ عالم ہے کہ اپنی عمر کی گنتی کے برابر کتابیں سپردِ قلم کر چکے ہیں - ہم حج کو روانہ ہونے لگے تو اپنی تازہ تصنیف "کتاب زندگی" کا نسخہ اپنے ایک مہربان کے لیے لے آئے جو ہمیں مکہ مکرمہ میں لے جا کر ان کے حوالے کرنا تھا - منشی صاحب کا اشارہ ہمارے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے - گو کہ یہ بات اُن کو بھی معلوم تھی کہ جدہ ایرپورٹ میں کتاب کا لے جانا جان جوکھوں کا کام ہے - پھر خیمہ سے وہاں ایک "ہدایت نامے" کا اعلان ہوا کہ کسی قسم کا لٹریچر آپ کے پاس ہو تو جمع کرا دیں، بالکل اسی طرح، جس طرح کہ کمرۂ امتحان میں عموماً سپرنٹنڈنٹ اعلان کرتے ہیں کہ آپ کے پاس کتاب یا کوئی کاغذ ہے تو یہاں جمع کرا دیں - بہرحال ان مہربان دوست کا تحفہ ہم سینے سے لگائے دعائیں پڑھتے بچ بچا کر ایرپورٹ سے باہر آ گئے - عرب ممالک میں ہماری طرح نہ ڈاک گھروں میں تقسیم ہوتی ہے نہ لوگ اپنے عزیز دوستوں کو گھر کا پتا بتاتے ہیں، صرف پوسٹ بکس کا حوالہ ہوتا ہے، اور ان مہربان کے پتے کی معلومات بھی ہمیں پوسٹ بکس تک ہی تھیں - ہم نے فوراً ان کو ایک خط لکھ مارا، اور موٹی تازی کتاب سینے سے لگائے مدینہ منورہ جا پہنچے - مہربان دوست جواب کیا دیتے! ہم نے تنگ آ کر (چوں کہ کتاب کو اٹھائے ہوئے ہم پریشان ہو چکے تھے) مدینہ میں امجد صاحب کو صورت حال بتائی - انھوں نے شام کو دفتر سے آ کر مژدہ سنایا کہ یہ صاحب مکہ الیکٹرک کمپنی میں کام کرتے ہیں - یہ فون نمبر ہے اور انتہائی خشک سالی کی پیداوار ہیں - اس وقت ہم اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکے - ہم نے ان صاحب سے فون پر رابطہ قائم کیا - سلام و نیاز کے بعد منشی صاحب کی خیر و عافیت بتائی اور عرض کیا کہ ایک کتاب کا تحفہ ملتان سے لے کر یہاں تک پہنچا ہوں - اگر میں ان مہربان کی جگہ ہوتا تو فی الفور کتاب حاصل کرنے کی کوشش کرتا - مگر اس مہربان نے کتاب کا نام تک دریافت نہیں فرمایا - مختصراً یہ جواب دیا کہ جب آپ مکہ آئیں تو مجھے مل لیجیے گا، میرا فون نمبر تو آپ کے پاس ہے ہی - سلسلہ منقطع...!

سولہ دن کے بعد جب میں مکہ پہنچا تو کتاب کی حفاظت میرے لیے وبالِ جان بن چکی تھی - مکہ میں عزیزہ سلیم اختر سے ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ مکہ بجلی کمپنی کے ایک دوست ہمارے ہاں تقریباً روز آتے ہیں، ان سے معلوم کریں گے - جب شام کو حرم شریف سے واپس آیا تو وہ صاحب موجود تھے - نام تھا قاضی یٰسین -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مہربان دوست کا نام لیا تو سنجیدہ صورت بنا کر بولے یہ تو میرے افسر ہیں اور میں ہی ان کا واحد ماتحت ہوں، اور ان کے بارے میں چند معلومات ہم پہنچائیں جو میں تحریر نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ کل آپ کی آمد کی اطلاع ان صاحب کو دے دوں گا اور اگر انھوں نے ملاقات کا اظہار کیا تو ساتھ لے آؤں گا۔ کئی دن کے بعد قاضی صاحب کو پھر پکڑا کہ بھائی حال سناؤ۔ وہ جواب مصلحتاً نہ دے سکے، آخر اپنے افسر کا جواب ہم تک کیسے من وعن پہنچاتے۔ لاچار ہم نے خود ہی فون پر رات کو رابطہ قائم کیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ ملتان سے ایک شخص آپ کا تحفہ لے کر آیا ہے، آپ کی رہائش تک آنا مشکل ہے۔ نو وارد ہوں آپ آسانی سے میرے پاس آسکتے ہیں۔ آپ کے ماتحت قاضی صاحب کو میری رہائش کا پتا معلوم ہے۔ اور آپ مجھے لفٹ ہی نہیں کراتے ہیں، مجھے آپ سے ملنے کی بھی خواہش ہے۔ ایک ماہ ہو گیا آپ کو کتاب کی یاد نہ آئی! بولے ڈاکٹر صاحب میں بہت عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ رہا کتاب کا مسئلہ تو قاضی جی کو ہی دے دیں۔ بس اس قدر مختصر بات کہہ کر پھر سلسلۂ فون منقطع . . . ! کتاب تو خیر ہم نے قاضی جی کو دے ہی دی تھی مگر سوچنے لگے، پاکستان سے یہاں آکر بسنے والے کبھی اخلاق اور تہذیب سے اتنی جلدی دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ اب میاں امجد صاحب کا جملہ یاد آیا کہ وہ تو خشک سالی کی پیداوار ہیں۔

ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلب سلیم

نعلین در بغلین

کچھ سنی سنائی باتیں ذہن میں تھیں، اسی وجہ سے میری اہلیہ نے جانب حجاز پرواز سے قبل کپڑے کے چھوٹے چھوٹے دو تھیلے سی لیے تھے کہ بوقت ضرورت اپنے جوتے ان میں رکھ کر بغل میں دبائے رکھیں گے۔ میرا تھیلا تو خیر سے ویسے ہی واپس آگیا نہ ہم سے ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ مگر میری رفیقۂ سفر نے "نعلین در بغلین" کی اصطلاح پر سختی سے عمل کیا۔ میرے چپل حرم نبوی اور حرم مکہ کے بیرونی جوتا دانوں سے باقاعدگی سے اٹھتے رہے۔ یہاں تک کہ مسجد قبا تک میں کبھی نہ چھوڑا۔ دریں وجہ مجھے ان متبرک مقامات میں عموماً برہنہ پا پھرنے کی سعادت ملتی رہی۔

جوتے اٹھنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہزاروں جوڑی جوتے دروازوں کے باہر جوتے دانوں میں پڑے ہوتے ہیں، لوگ بھول کر ایک دوسرے کے پہن جاتے ہیں اور یہی عام رواج ہے۔ میں نے بھی ایک دن ایسا کرنے کی کوشش کی مگر رفیقۂ سفر نے سختی سے روکا اور میں نے عمل کے حامی نہیں کیونکہ [illegible] چپل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ئیں نے پہنا اس کو بھی شدید کوفت ہوگی۔ پس وہیں لاکر رکھ دیے۔ حج کی رات تھی ہم یعنی میں، اہلیہ اور عزیزہ ممتاز صاحب بیت اللہ میں طوافِ زیارت کے لیے آئے۔ طوافِ زیارت ہی وہ موقع ہوتا ہے جب حرم بیت اللہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی اور بیک وقت سات آٹھ لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیگم کا اصرار تھا کہ وہ اپنا جوتا اپنی بغل میں داب لیں گی اور میری گزارش یہ تھی کہ آج بہت ہجوم ہے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہے، جوتے جوتے دان میں رکھیں۔ بہ مشکل وہ راضی ہوئیں اور ممتاز صاحب نے تینوں جوڑی جوتے تھیلی میں بند کرکے ایک مقام پر بہ حفاظت رکھ دیے۔ تین چار گھنٹوں کے بعد جب اس مقام پر آئے اور ممتاز صاحب نے تھیلی کھولی تو ان کا منہ لٹک گیا، کیوں کہ ان کی ضد پر ہی جوتے ان کے حوالے کیے گئے تھے، جہاں ہمارے پرانے چپل موجود تھے اور تھیلی کے اندر سے بیگم کا جوتا غائب تھا جو چند دن پہلے پچاس ریال میں خریدا تھا۔ پھر کیا ہوا نہ پوچھیے وہ اللہ کی بندی پیدل چلتی رہی کیوں کہ رات کا ایک بجا تھا اور بازار بند ہو چکے تھے۔ ع۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

کاکوس

تیس بتیس سال قبل کی بات ہے کہ ہم نے کراچی میں ڈاکٹری کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ ہاسٹل میں پہنچتے ہی ایک ملازم نما شخص سے پوچھا۔ بھائی لیٹرین کدھر ہے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا "کاکوس" اس طرح جناب ہم اس لفظ سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئے۔ کراچی میں اس مقام سے ہمیں کافی رابطہ رہا۔ وہاں سے واپس پنجاب آکر ہم پھر یہ لفظ بھول گئے۔ بعد ایک مدت کے مکہ شریف میں باب الفتح کے باہر ایک دروازے پر "کاکوس" لکھا ہوا دیکھ کر احساس ہوا کہ عربی زبان کے ایک لفظ سے پرانی راہ و رسم ہے۔ طہارت کے لیے وہاں کاکوس بہت ہیں۔ صاف ستھرے صفائی کرنے والے ہمہ وقت موجود۔ مگر استعمال کرنے والے بھی تو کم نہیں۔ قطار اندر قطار منتظرین موجود ہیں۔ رہی پانی کی بات تو پچھلے پہر رات کے بعد صبح تک پانی نارمل درجۂ حرارت کا ملتا ہے۔ جیسے جیسے سورج چمکتا ہے پانی بھی تپنے لگتا ہے اور ظہر کے بعد سے رات تک بس چائے تیار کرنے والے پانی سے واسطہ رہتا ہے۔ یہی پانی سب لوگ استعمال کرتے ہیں، ہم نے بھی کیا، اور وہ بھی جلدی جلدی کیوں کہ منتظرین دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں۔ یہ بہت کم ہوتا تھا کہ کوئی کاکوس خالی مل جائے ورنہ تو کچھ دیر انتظار کی گھڑیاں گننی پڑیں۔ ایک دن انہیں ایک دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ ہم جلدی سے اندر پہنچے جب طہارت کی ضرورت پیش آئی تو ٹونٹی میں پانی غائب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب سمجھ میں آیا کہ یہ کموڈ کیوں خالی تھا، اس کی ٹونٹی خراب تھی - اب کیا کروں - غیر جگہ - اتنی بولی آتی نہیں، پھر آتی ہو تو کون سنتا ہے - باہر شور و غل، دروازے اور فرش کے درمیان کافی جگہ نظر آئی - لوٹا کواڑ کے نیچے سے باہر نکالا اور دروازے کے باہر کے حصے سے مارنا شروع کیا تاکہ کوئی خدا ترس میری حرکت کو سمجھ کر ترس کھا جائے - کافی دیر تک دو دو کے بعد یہ حرکت کارگر ہوگئی اور لوٹا کسی نے پکڑ لیا جب لوٹا چلا گیا تو اب اور گھبرائے کہ لوٹا واپس نہ آیا تو پھر! مگر کچھ دیر کے بعد لوٹا واپس پانی سے بھرا ہوا دروازے کے نیچے سے واپس مل گیا، اور ہم جب باہر آئے تو اتنی دیر اندر لگانے پر باز پرس ہوئی - ہم نے واقعہ سنایا تو بیگم صاحبہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئیں - کہنے لگیں یہ واقعہ ضرور ڈائری میں لکھیے گا - شاید کسی کے کام آئے - ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

شوق آفرینی

مکہ شریف سے منیٰ جاتے ہوئے تمام پہاڑوں سے بلند و بالا، منفرد ایک گول چوٹی دعوتِ نظارہ دیتی ہے - یہی جبلِ نور ہے، جس میں غارِ حرا واقع ہے - منیٰ سے یہاں عموماً آمد و رفت رہتی تھی - چوں کہ نمازِ عصر و مغرب جبلِ رحمت یا مسجد نمرہ میں پڑھنے کا شوق تھا، ایک دن ادھر سے گزرتے ہوئے سلیم اختر سے دریافت کیا کہ سلیم میاں کسی دن ہمیں غارِ حرا تو لے چلو - سلیم میاں کا جواب سن کر میں دھک سے رہ گیا کہ انکل یہی تو سامنے جبلِ نور ہے - میں تو بے تاب ہو اٹھا مگر انھوں نے اس وقت حامی نہ بھری اور کہا کہ یہاں صبح کے وقت جانا آسان ہے، اب شام ہوگئی ہے، اور ہم سیدھے عرفات چلے گئے اور میں تمام راستے غارِ حرا کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں ابھرتا اور ڈوبتا رہا -

اگلے دن بعد نمازِ فجر حرم شریف سے سیدھے جبلِ نور جا پہنچے - اہلیہ اور سلیم صاحب تو کار ہی میں بیٹھے رہے، میں اور ممتاز صاحب بسم اللہ پڑھ کر نیچے اتر آئے - ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر نگاہ ڈالی جہاں خاتم النبیینؐ کو خدائے ذوالجلال نے نعمتِ فرقان سے نوازا تھا - درود و سلام پڑھتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے گئے - اونچے نیچے پتھر، ناہموار راستہ، کہیں کہیں بالکل عمودی شکل میں، کہیں ڈھلوان، کہیں کشادہ، کہیں تنگ، ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے چڑھتے گئے - غرض چوٹی پر پہنچ گئے - سورج مشرق میں دامنِ افق سے جھانک کر اپنا رنگ دکھانے لگا تھا اور ابھی سے ہمیں پسینے چھوٹ رہے تھے - چند عشاقِ رسول ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ے بھی پہلے یہاں پہنچ کر سستا رہے تھے اور کچھ ابھی ہانپ کانپ رہے تھے، ہم بھی انہی میں شامل ہو گئے۔ معلوم ہوا ابھی دوسری جانب اترائی ہے۔ سب منزل دور لیست کا نعرہ لگا کر چل پڑے۔ اترائی قدرے مشکل تھی۔ یہ ست ایک پتلی سی سرنگ میں سے گزر کر کھلے آسمان کے نیچے آ جاتا ہے، اور یہی وہ مقامِ مقدس ہے جہاں راج الانبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جبرئیل امین کے مابین سلسلۂ درس و تدریس شروع ہوا تھا۔ غار کے بالائی مے پر نگاہ گئی تو طبیعت پھڑک اٹھی۔ سرخ رنگ کے استر پر سفید رنگ سے جلی حروف میں لکھا تھا: سرأ باسم ربک الذی خلق ۰ خلق الانسان من علق" اور اس کے نیچے لکھا تھا "محمد شرف۔ چکوال پاکستان" یہاں بھی پاکستانی مسلمان نے اپنی گہری عقیدت اور جذبۂ نسبت کی روایت کو نش کر دیا۔

ہمیں حیرت و استعجاب میں غرق تھا، سب نوافل میں مصروف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوتِ گویائی لب ہو گئی ہے اور قوتِ متخیلہ پرواز کر کے چودہ سو سال پیچھے چلی گئی ہے۔ بہ مشکل دل کو سنبھالا۔ کچھ نت کے بعد غار کے اندر داخل ہو گئے۔ نوافل ادا کیے، دعا مانگی۔ یہاں سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا، مگر باہر ی دیر سے میں بری طرح اور دیوانے جمع ہو کر میرے منتظر تھے۔ لاچار باہر آنا پڑا۔

سرمہ خاکِ پا عنایت ہو　　آ گیا ہے غبار آنکھوں میں

ب سخن نہ دارد

پاکستانی حجاج وہاں متعدد مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ رہائش اور خوراک دو اہم ضرورتیں ہیں۔ لہ اب حکومتِ وقت نے بہت سی سہولتیں بہم پہنچانے کی سعی کی ہے۔ گروپ سسٹم ایک طریقِ کار ہے، ر بیشتر افراد کو گروپ لیڈروں کے کردار سے نالاں اور شاکی ہی پایا۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہ کہ خستہ یا ناروا لباس میں کوئی مرد یا عورت آپ کو نظر آئے تو بے دریغ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہ۔ آداب و لباس میں سب سے قابلِ تعریف انڈونیشیا ہے بلکہ سرِ فہرست ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیڈ یونٹ فوجی دستہ مارچ کر رہا ہے۔ ترکی کے مرد حجاج خاکی بو شرٹ پتلون میں وجیہ نظر آتے ہیں۔ نائیجیریا جنوبی افریقہ گو رنگت میں منفرد ہیں مگر لباس کی صفائی ستھرائی میں کسی سے کم نہیں۔ ہندوستان کے حجاج کو و لباس کے معاملے میں بدحال ہی نظر پایا۔ مگر پاکستانیوں کی کثیر تعداد مرد ہوں یا عورتیں ذوقِ تشخص سے بے نیاز میں کی صفائی ستھرائی سے بے پروا ادھر ادھر نظر آئے۔ بعض مستورات کو تو مسجد نبوی میں بھی باقاعدگی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرخی لپ سٹک سے آراستہ کرکے چہل قدمی کرتے دیکھا۔ بشرے سے وہ پاکستانی نظر آتی تھیں، جن کو میں نے سختی سے تنبیہ کی جس کے نتیجے میں ان عورتوں نے فوری طور پر دوپٹے سے یہ خرافات صاف کر ڈالیں۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ ٹرانسپورٹ اور رہائش کا عمدہ انتظام ایران کا تھا۔ ویسے تو نائیجیریا، انڈونیشیا اور مصر کی بھی اپنی ٹرانسپورٹ تھی مگر کیا کہنے ایران کی تنظیم کے۔ حجاج ایران کے لیے پورے پورے محلے مختص کر دیے گئے تھے، جس کے ثبوت میں ان بلڈنگوں کے اوپر اور کھڑکیوں میں ایرانی جھنڈے نصب کر دیے گئے تھے۔ مکہ روڈ ٹرانسپورٹ کی نصف سے زائد بسیں انھوں نے اپنے حجاج کے لیے ریزرو کروالی تھیں جن کے ثبوت و نشان دہی میں بسوں کے تیشوں پر ایرانی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ تو خیر سے ایرانی تیل کی دولت کے کرشمے تھے۔ مگر نائیجیریا اور انڈونیشیا جیسے ملکوں نے بھی اپنے ممالک کے حجاج کی تکالیف کو رفع کرنے کے لیے بسوں کی سہولتیں بہم پہنچا دی تھیں۔ پاکستانی حجاج صابر و شاکر دھکے کھاتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جن پر پاکستان کے "خدا رسیدہ بزرگوں کی نگاہِ کیمیا اثر مائل بہ کرم تھی" وہ ضرور محترم و موقر تھے۔

جدہ ایرپورٹ پر پاکستانی حجاج اپنے ملک واپس آنے کے لیے اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جن صعوبتوں سے دوچار تھے، اسے وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہو۔ ہم سوچتے رہے کہ یہ سب بے پناہ شاپنگ کا نتیجہ ہے۔ سامان کے یہ ڈھیر ان کے لیے وبال جان بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کے حجاج نے پاکستانی حجاج کے مقابلے میں زیادہ ہی ڈھیر لگا رکھے تھے مگر ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پی آئی اے کی جانب سے وزن کرانے اور چیکنگ کے مسائل درپیش تھے۔ ایرانی پرواز تیار تھی، حجاج کا سامان جمع کیا گیا اور ایک ٹرالی کے ذریعے جہاز تک لے جا کر جہاز کے پیٹ میں بھر دیا گیا اور حجاج آرام سے وقت مقررہ پر جہاز میں سوار ہو گئے۔ کیا ضرورت ہے سامان کی چیکنگ اور تولنے کی، قوم کا سامان ہے اور قوم عازم سفر ہے۔

ہوائی جہازوں میں اکثر و بیشتر سفر کرنے کی سعادت و توفیق ملتی رہی ہے۔ مگر جس حساب سے اس جہاز کے اندر حجاج کو ٹھونسا گیا وہ اپنی مثال آپ تھی۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ جہاز میں کتنے مسافر تھے مگر کرسیوں کو اس قدر قریب کر دیا گیا تھا کہ صورت حال یہ تھی کہ دو قطاروں کے درمیان بمشکل ایک بالشت جگہ تھی جس میں سے میں تو کسی نہ کسی طرح اَڑ پھنس کر بیٹھ گیا مگر فربہ اندام قسم کے لوگوں کو چار گھنٹے کی پرواز میں جو سزا ملی وہ وہی جانتے ہیں۔ اس پر کارکنوں کی بے رخی اور بھی افسوس ناک تھی۔ کاش وہ اس تکلیف کا احساس کریں۔

© rasailojaraid.com